دیوانِ میر فارسی (اردو ترجمہ) میں رنگوں کا استعمال

Use of colors in Dewan-i-Mir Persian (Urdu translation)

Ali Hassan

Research scholar, Urdu Department, GC University, Lahore.

ABSTRACT

Colors play a fundamental role in the process of evoking emotions in human life. Colors are closely related to human psychology and cosmic psychology. Whether colors are cosmic or emotional, it is a fact that the universe and human personalities are diverse because of colors. When red, pink, blue, black, purple, white, yellow, saffron, green, aqua and violet flowers bloom from a green plant, feelings spring, and life flourishes. Mir Taqi Mir has used colors extensively in his poetry. He uses colors in two ways, one to show emotions, and the other to present scenes of the world. In this article, Mir's poetry is analyzed in the context of colors.

Keywords: رنگ، جذبات، انسانی نفسیات، پھول، تنوع، تقویت

رنگ، انسانی زندگی میں رنگ بکھیرنے کے عمل میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ رنگ کائناتی ہوں یا جذباتی، یہ حقیقت ہے کہ رنگوں ہی کی بدولت اس کائنات اور انسانی شخصیات میں تنوع ہے۔ اگر اس کائنات میں رنگ نہ ہوتے تو زندگی بے کیف ہو کر رہ جاتی، اور انسان اس بے کیفی سے گھبرا کر زندگی کا خاتمہ کر بیٹھتا۔ آسمان میں سنہرا سورج چمکتا ہے تو چرخ کا رنگ نیلا اور چاند کی روشنی سفید۔ سبز پودے سے جب سرخ، گلابی، نیلے، پیلے، کالے، جامنی، سفید، زرد، کیسری اور بنفشی رنگ پھولوں کی صورت کھلتے ہیں تو جذبات میں بہار آجاتی ہے اور زندگی مچل اٹھتی ہے۔

اگر رنگ کا وجود نہ ہوتا تو یہ تنوع، یہ تضاد وجود نہ رکھتے اور کائنات یک رخی، یک رنگی بن کر بے حیثیتی کی تصویر بن جاتی۔ کیوں کہ زندگی نام ہے تضاد کا۔ کائناتی وجود میں رنگوں کی وہی اہمیت ہے جو انسانی وجود میں زندگی کی اونچی نیچی دوڑتی سانسوں کی۔ رنگ اور جذبات کا گہرا تعلق ہے۔ جتنے زمین میں رنگ ہیں، اتنے ہی رنگوں کو انسانی وجود میں پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ انسانی وجود کا ہر رنگ ایک نئے اور انوکھے جذبہ کی کوکھ ہے۔

شاعر معاشرے کی زبان ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے اور محسوس کرتا ہے اس کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ دیکھنے کی دو اقسام ہیں۔ ایک دیکھنا ہے وہ دیکھنا ہے جس میں نظر باطن پر ہوتی ہے اور جذبات و احساسات دیکھے جاتے ہیں۔ سادہ لفظوں میں اندرونی

کائنات میں جھانکا جاتا ہے اور اس میں موجود راز عیاں کیے جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس واقعہ کو بنایا جا سکتا ہے کہ جب لکھنؤ کے ایک نواب، میر تقی میر کو ایک ایسی جگہ لے گئے جہاں ایک طرف گھر تھا اور دوسری طرف باغ۔ باغ کا نظارہ کھڑکی کھول کر کیا جا سکتا تھا۔ میر جس دن وہاں تشریف لے گئے، اس روز کھڑکی بند تھی۔ انہوں نے اسے کبھی نہ کھولا۔ اور جب ایک دن ایک دوست نے آ کر بتایا کہ دوسری طرف باغ ہے تو میر نے کچھ غزلیں دکھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔''[۱] دوسری قسم وہ ہے جس میں شاعر خدا کی تخلیقات کو دیکھتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور اسے اپنی شاعری میں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس قسم کی شاعری میں موسم، پہاڑ، ندیاں، دریا، برکھا، خزاں، پرند، انساں، بہار، رنگ، پودے، پھول الغرض مظاہر قدرت کا بیان ملتا ہے۔ اس قسم کے دیکھنے کی روایت ہمیں اردو غزل کے باوا آدم، ولی دکنی کے ہاں بھرپور رعنائی کے ساتھ ملتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں۔ ''ولی کے ہاں فکر و فلسفہ کی جگہ حواس، محسوسات اور جذبات کی شاعری ہے۔ اس شاعری کے منظر نامہ میں فطرت کا کردار بہت اہم ہے۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، پھول، رنگ، باغ، میدان، پہاڑ اور خوشبو کے مظاہر چاروں طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔ ولی ان مظاہر کا ان تھک تماشائی ہے۔''[۲] جب شاعر اندرونی کائنات کی طرف دیکھتا ہے تو انسانی جذبات کے رنگوں کو معاشرے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور بیرونی کائنات کو دیکھتا ہے تو فطرت کے مظاہر کے رنگ چار سو بکھیر دیتا ہے۔ اس مضمون کا تعلق دیکھنے کی دوسری قسم سے وابستہ ہے، اور مقصد کائناتی رنگوں کے استعمال اور بیان کی جھلکیاں پیش کرنا۔ اردو کے ہر دور کے شعرا کے ہاں کائناتی رنگوں کا استعمال نظر آتا ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں اس کی مثال قلی قطب شاہ کی شاعری سے پیش کی جا سکتی ہے۔

قلی قطب شاہ نے اپنے عہد کے ہر موسم، تہوار اور میلے وغیرہ کو بیان کیا ہے اور ان موقعوں پر کون سے رنگوں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی کو اپنی شاعری میں واضح کیا ہے۔ برسات کے موسم میں سبز رنگ کا مخمل فرش پر بچھا دیا جاتا اور سبز لباس زیب تن کیے جاتے تو دوسری طرف بسنت اور جشن نوروز میں سرخ رنگ کا راج ہوتا۔ ان کی شاعری سے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

جھاڑاں کوں پھول ہور پھل سہتے ہیں جیوں جواہر
صدراں زمرددی رنگ ہر اک محل بچھاو[۳]

مرزا محمد رفیع سودا کی شاعری میں عروس معنی، رنگینی معنی، اور حسن معنی ایسی تراکیب سے جمالیاتی حس کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی جمالیاتی حس کی تیزی ہی کی بدولت رنگ، روشنی، بہار، گلزار، صبح، شادابی، شعلہ، سرخی اور آئینہ جیسے لفظوں سے کی گئی مصوری ملتی ہے۔ اور سنہرا، صندلی، حنائی، چمپئی، شفقی، سفید، گلابی، نیلا، بادامی، سبز، سرخ، کبودی اور پیلا رنگ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

لعل حل کردہ ہے جوں ظرف بلوریں کے بیچ
پیرہن پہنے ہے جس دم وہ گل اندام سفید[۴]

میر تقی میر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری بیرونی مناظر کی بجائے اندرونی منظر کشی پیش کرتی ہے۔ مگر ایسا ہرگز نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میر تقی میر کو ابتدائی ناقدین نے ہمارے سامنے پیش ہی ایسے کیا ہے کہ ہمیں ان پر بدھ مت کے بھکشو کا گماں ہوتا ہے، جو ہمیشہ مراقبے میں رہتا ہے۔ ڈاکٹر احتشام حسین اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''اکثر لکھنے والوں نے ان کی داخلیت پر اتنا زور دیا کہ بیرونی دنیا سے میر کا جو تعلق تھا وہ نظر انداز ہو گیا۔''[۵]

میر تقی میر کے دیوان میں کشمیر کی وادی کے آسمانی رنگ سے لے کر زعفرانی رنگ تک، کئی طرح کے بے شمار رنگ موجود ہیں۔ میر تقی میر کے دیوان میں سرخ، سبز، گلابی، نیلا، زرد، کاہی، زعفرانی، آبی، آتشی، حنائی، عنابی، شفقی، سفید اور سیاہ وغیرہ کے انوکھے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر لگتا ہے کہ میر تقی میر مصور کی طرح مختلف رنگوں کے اختلاط سے لفظی تصویریں کینوس پر اتار رہے ہیں۔

چاک دل ہے ازار کے سے رنگ
چشم پر خوں نگار کے سے رنگ [۶]

اردو شاعری کے ہر شاعر کے یہاں بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ وہ رنگ کو کیسے دیکھتے، محسوس کرتے اور اپنی شخصیت میں جذب کرتے ہوئے، مناظر کی تصاویر کشی کرتے۔ شاعری میں رنگوں کے استعمال کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی (عوامی شاعر) بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ نظیر اکبر آبادی ایسا شاعر ہے جس نے معاشرے میں جس چیز کا مشاہدہ کیا، اسے شاعری کی صورت پیش کیا۔ ان کی شاعری میں طلائی، سفید، چمپئی، سرخ، نیلا، سبز، کالا، جامنی، دھانی، بسنتی، سرمئی، گلابی، گلناری، زرد، مہندی، کاہی، آتشی، شمعی، خاکستری، کشمشی، غرض بے شمار قسم کے رنگ بکھرے پڑے ہیں۔ مگر وہ ان رنگوں کے بس نام ہی گنواتے ہیں، تصاویر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

پوشاک چھڑکواں سے ہر جا تیاری رنگیں پوشوں کی
ہر جا گہ زرد لباسوں سے ہوئی زینت سب آغوشوں کی
اور بھیگی جا گہ رنگوں سے ہر گنج گلی اور کوچوں کی
سو عیش و طرب کی دھومیں ہیں اور محفل میں مے نوشوں کی
مے نکلی جام گلابی سے کچھ لہک لہک کچھ چھلک چھلک [۷]

ان کو عوامی شاعر اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ماحول اور عوامی مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو بیان کرنے کے لیے مشاہدہ لازمی عنصر ہے۔ اور مشاہدے کے بعد تنوع پیدا کرنے اور چیزوں کے درمیان حد تفاوق کھینچنے کے لیے مختلف رنگوں کا استعمال ناگزیر۔

چیزیں تضاد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں اور تضاد واضح کرنے میں رنگ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعری کی اصل بنیاد تضاد ہے۔ شاعر مناظر کشی اور جذباتی منظر نگاری کرنے کے لئے رنگ استعمال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اردو شاعری میں رنگوں کی بہتات ہے اور ہر سو گلشن کھلے نظر آتے ہیں۔ اب ہم اصل موضوع، ''میر تقی میر کے فارسی دیوان (اردو ترجمہ) میں رنگوں کا استعمال'' کی جانب بڑھتے ہیں۔

میر تقی میر اردو ادب میں ایک ایسے لفظی مصور کے طور پر مشہور ہیں جن کے قلم سے غم ٹپکتا ہے اور الفاظ سے اداسی چھلکتی ہے۔ ان کے متعلق یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ اندرونی دنیا کی منظر کشی کرنے میں اتنا منہمک ہو جاتے ہیں کہ بیرونی دنیا کی خبر تک نہیں رہتی۔ اس کے پیچھے سب سے مضبوط ہاتھ مولانا محمد حسین آزاد کا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کے ایک نواب نے میر کو ایک ایسی جگہ ٹھہرایا جس کے ایک طرف مکان اور دوسری طرف باغ تھا۔ کھڑکی سے باغ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ جس دن میر صاحب وہاں گئے، کھڑکی بند تھی۔ میر نے کبھی کھڑکی کھول کر نہیں دیکھا کہ دوسری جانب کیا ہے۔ ایک دن میر کے دوست ان سے ملنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ دوسری طرف باغ ہے [۸]۔ میرا مقصود یہ ثابت کرنا نہیں کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے۔

عین ممکن ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہو۔ مگر ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر ایک مخصوص ٹھپہ لگانا جائز نہیں۔ میر تقی میر کی شاعری میں مناظر فطرت کے ساتھ ساتھ فطری رنگ بکھرے ملتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ کشمیر کی وادی میں چلے آئے ہیں اور جہاں نظر جاتی ہے سرخ، نیلے، پیلے، سبز، جامنی، کاہی، کیسری، خاکستری، صندلی، عنابی، چمپئی، شمعی اور طلائی رنگوں کے علاوہ اور کئی طرح کے بے شمار رنگوں کے پھول کھلے نظر آتے ہیں۔

میر تقی میر کے چھ ضخیم اردو دواوین ہیں۔ ان کے علاوہ ایک فارسی مجموعہ کلام بھی ملتا ہے۔ فارسی کتاب قلمی نسخوں کی صورت میں مختلف ذخائر مثلاً مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کتاب خانہ درگاہ شاہ غمگیں دہلوی، کتاب خانہ ریاست رام پور، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد، وغیرہ میں موجود تھی۔ اردو کے مختلف تاریخ نگاروں نے جن میں ڈاکٹر ابو للیث صدیقی، محمود حسن قیصر، وزیر الحسن عابدی وغیرہ شامل ہیں نے تعارفی مطالعہ کا حق ادا کیا تھا مگر پہلی بار یہ نیر مسعود رضوی اور اکبر الدین صدیقی کی کاوش سے نقوش کے میر نمبر میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اردو کے قالب میں منتقل کرنے کا کارنامہ افضال احمد سید نے سرانجام دیا اور نثری ترجمہ کی صورت آکسفورڈ پریس کراچی سے شائع ہوا ہے۔

اس کتاب میں بکھرے مناظر میں بے شمار رنگوں سے میناکاری اور مصوری کی گئی ہے۔ رنگوں میں آبی، خاکی، سرخ، سفید، سبز، کالا، آتشی، نیلا، چمپئی، صندلی، اور پیلا وغیرہ کا استعمال بکثرت ہے۔ مضمون زیر نظر میں کتاب ''میر تقی میر، دیوانِ فارسی، معہ اردو ترجمہ'' کو رنگوں کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

میر کے فارسی دیوان (اردو ترجمہ) میں سرخ رنگ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ سرخ رنگ انقلاب، آزادی، خوشی، مسرت، قربانی، کا رنگ ہے۔ یہ ایسا رنگ ہے جس کو نہ صرف برصغیر کے ادب میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، بلکہ انٹرنیشنل ادب میں بھی الگ پہچان رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کتاب ''میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' میں سرخ رنگ کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''ماہرین نفسیات کا نظریہ یہ ہے کہ سرخ رنگ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ سرخ رنگ محبت اور خلوص تقسیم کرتا ہے۔ سرخ رنگ شہادت کا رنگ ہے، آزادی اور انقلاب کا رنگ ہے۔ سرخ رنگ قربانی کا جذبہ دل میں موجزن کرتا ہے۔ سرخ رنگ انسان کو فتح کے لیے بے چین رکھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ عرب، ہندوستان، پاکستان، چین اور جاپان میں سرخ رنگ خوشی، مسرت، شادی، بیاہ کا رنگ ہے۔"[۹]

میر تقی میر کے دیوان فارسی میں سرخ رنگ ہر سو بکھرا پڑا ہے۔ وہ اسے کبھی انقلاب کے تناظر میں پیش کرتے ہیں تو کبھی خونی ہولی کے معنوں میں۔ سرخ رنگ اور ظالم و مظلوم کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مظلوم شخص دو طرح سے رد عمل ظاہر کرتا ہے۔ یا تو میدان میں نکل آتا ہے اور ظلم کرنا شروع کر دیتا ہے یا صبر کا دکھاوا کرتا ہوا خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ میر تقی میر نے سرخ رنگ کو مؤخر الذکر تناظر میں پیش کرتے ہوئے نئی تفہیم پیش کی ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ان کے خونی آنسو اس کائنات کے لیے ابر باراں کی مانند ہیں۔ جس طرح بارش سے بہار آتی ہے اور پھول کھل اٹھتے ہیں اسی طرح میر کے خونی آنسوؤں کی بدولت رنگ پھوٹ پڑتے ہیں۔

> ''ہماری خون رونے والی آنکھوں نے سو جگہ تازہ رنگ بکھیر دیے ہیں۔''[۱۰]

کلاسیکی شعرا نے اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں وہ وہ شعر موزوں کیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ میر تقی میر نے اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں نیا رنگ اختیار کیا ہے۔ میر محبوب کے چہرے کی سرخی کو لالہ اور گل سے زیادہ فزوں اور نکھری ہوئی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

کاش (وہ) ایک بار گلشن کی طرف بے نقاب گزرے
لالہ اور گل کو اپنے چہرے کے حسن پر غرور ہے[۱۱]

یہاں تو پھر چہرے ہی پر اکتفا کیا ہے۔ ایک جگہ وہ محبوب کے پاؤں کی خاک کو اتنا سرخ بیان کرتے ہیں کہ وہ گل کے چہرے کا غازہ بن سکتی ہے۔

باغ میں گل کی آنکھ دن رات تیری راہ پر لگی ہے۔
کہ تیرے پاؤں کی خاک ہاتھ میں اٹھائے اور (اپنے چہرے کا) غازہ کرے[۱۲]

غازہ وہی چیز ہوتی ہے جو رعنائی کو معطر اور حسن میں اضافہ کر دے۔ خاک پا کو غازہ سے تشبیہ دینا انوکھی تشبیہ ہے۔ انقلابی رنگ کو اتنی لطافت سے بیان کرنا کہ وہ چہرے کا غازہ اور محبوب کے رخسار کی سرخی قرار پائے، سحر انگیز ہے۔ مگر اس سحر انگیزی میں جب میر انقلاب کے تناظر میں سرخ رنگ کو بیان کرتے ہیں تو خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔

شہر میں بے انتہا خون روئے
سیلاب خون کی راہ صحرا سے جا ملی[۱۳]

آرٹ کی دنیا میں سبز رنگ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ رنگ اپنے اندر فخر کا جذبہ لئے ہوئے، شادابی بکھیرتا ہے۔ یہ رنگ انسان کی زندگی میں سنسناہٹ پیدا کرتا ہے۔ اور اس رنگ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ کسی رنگ کے ساتھ نہیں کھلتا، سوائے سرخ رنگ کے۔ سبز رنگ دیکھ کر ذہنی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔ میر تقی میر نے اپنی شاعری میں اس رنگ کا استعمال اکثر سرخ رنگ کے ساتھ کیا ہے تاکہ اس کی چمک، کھل کر سامنے آ سکے۔ دیکھئے:

دوبارہ آ کر اس باغ سبز کے لالہ کو دیکھ۔
وہ کمر تک خوں میں اس طرح کب بیٹھا ہے کہ جیسے ہم[۱۴]

انسانی نفسیات میں شامل ہے کہ جب وہ سبزہ کو دیکھتا ہے تو اس کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اور آنکھیں کھل اٹھتی ہیں۔ سائنسی طور پر بھی یہ بات ثابت ہے۔ اس وجہ سے آنکھوں کی خرابی سے بچنے کے لئے سبزے کو دیکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اسی سائنسی/نفسیاتی حقیقت کو میر تقی میر یوں بیان کرتے ہیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیرے خط پر آنکھیں سینکے
تیرے چہرے کے گرد اس سبزے کا نہ اگنا بہتر ہے[۱۵]

سبز رنگ فطری رنگ ہے۔ اس وجہ سے اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ میر اس وسیع کینوس کو سمیٹ کر ایک نکتہ میں یوں مرکوز کر دیتا ہے۔

اس سال اس طرح آبیاری ہوئی کہ جیسے
جوئے گلستان کا سبزہ چشم تر کی مژہ ہو[۱۶]

انسانی نفسیات میں نیلے رنگ کو بہت اہم گردانا جاتا ہے۔ سائیکالوجی کے مطابق یہ وہ رنگ ہے جو سکون، اطمینان اور اعتماد کی علامت ہے۔ مگر کلاسیکی شاعری میں اسے ہمیشہ مصیبت، دکھ، درد، غم اور المیہ کے بیان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیلا رنگ، اس نشان سے عبارت ہے جو چوٹ لگی جگہ پر خون جم جانے سے پڑ جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس رنگ کو ظالم رنگ کہا جاتا ہے۔ میر تقی میر کے ہاں بھی، کلاسیکی روایت کے مطابق، نیلا رنگ دکھ اور درد کے تناظر میں ملتا ہے۔ میر تقی میر کہتے ہیں کہ نیلا رنگ جہاں پڑتا ہے، وہاں آسمان کی مانند، غم کی چادر چھا جاتی ہے۔ میر، جہاں اس رنگ کو دکھ درد کا رنگ قرار دیتے ہیں۔ وہاں اسے ظالم اور خود کو مظلوم بتاتے ہیں۔

وہ غم زدہ کس طرح زندہ رہے کہ جسے آسمان نے
طرح طرح کے غم دیے اور چشمِ نم نہیں دی[۱۷]

جہاں میر نے نیلے رنگ کو ظالم کا رنگ اور غم کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے، وہاں وہ اسے دھوکہ کی علامت بھی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے طلسم سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

جانے سے غافل مت ہو کہ یہ چرخ نیلی کی عالی شان عمارت
یاروں کی گردِ راہ سے اٹھا ہوا ایک غبار ہے[۱۸]

سادہ معنوں میں، میر کے ہاں نیلا رنگ دکھ، درد، غم، فناہ، اور الم کا رنگ ہے۔ زرد رنگ کی بہت اہمیت ہے کیونکہ یہ غم سے پیدا ہونے والے تاثرات کو عیاں کرتا ہے۔ یہ رنگ ڈر، خوف، خزاں، قحط، زوال اور خشکی کا رنگ ہے۔ قرآن مجید میں بھی اسی معنوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ البتہ قرآن پاک میں گائے کے رنگ کے طور پر اسے خوش رنگ بھی کہا گیا ہے۔ میر تقی میر اس رنگ کا استعمال عشق میں ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے حالات، بیماری، فراق اور خزاں کے بیان کے لیے کرتے ہیں۔

زرد چہرے پر ملامت کا غبار ہے[۱۹]
میرے زرد چہرے سے سرخ آنسو ایک ربط رکھتا ہے۔
اس سے پہلے اے ہم نشیں میرے چہرے پر رنگ تھا[۲۰]

خون کا بہہ جانا اور چہرے کا رنگ زرد پڑ جانا ایک مسلم سائنسی حقیقت ہے۔ میر نے اس حقیقت کو کیا خوب نبھایا ہے۔

زرد رخسار اور گریہ ناک اور نزار
میر کو فراق میں حالات ہیں[۲۱]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ میر کے ہاں زرد رنگ ایک ایسا رنگ ہے جو جدائی کی آندھی چلنے کے بعد چھا جانے والی کہر کا رنگ ہے۔ ایک ایسا رنگ جس کے زرہ زرہ سے ہجر کا نوحہ اٹھتا ہے، اور غم کی لے کے ساتھ فراق کا بول الاپتا ہے۔

سفید رنگ امن کا رنگ ہے۔ اس رنگ کی جس چیز میں آمیزش ہوتی ہے وہ امن کا پیغام بن جاتی ہے۔ چاند کی روشنی سفید ہوتی ہے، اس وجہ سے اسے محبت کے جذبات ابھارنے کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ میر تقی میر نے سفید رنگ کو محبوب کے حسن کے حوالے سے لفظوں میں ڈھالا ہے۔ دیکھئے:

جب تک اس کے چہرے کے سامنے نہیں آتا چاند کی عافیت ہے۔
جس وقت مقابلہ ہوا، اس کا کام تمام ہو گیا[۲۲]

محبوب کے چہرے کو چاند سے ملانا اور ماہ طلعت کا خیال اور چہرہ، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ میر نے سفید رنگ کو حسن کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

کالا رنگ ایسا رنگ ہے جس کے اندر بازگشت نہیں ہوتی۔ یہ ماتم کا رنگ ہے۔ اگر لباس میں استعمال کیا جائے تو طاقت کی علامت ہے۔ بری بلاؤں کو دور بھگاتا ہے۔ اس رنگ میں مدافعت کی قوت موجود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ دفع اور جزب کی قوت رکھتا ہے۔ اور یہ اسی قوت کا ہی نتیجہ ہے کہ عاشق محبوب کی کالی زلف کے اسیر ہو جاتے ہیں اور خال پر مر مٹتے ہیں۔ میر تقی میر نے اس رنگ کو محبوب کے بال، خال، سیاہ دل، سیاہ ارادے کے ساتھ ساتھ دنیا کی تاریکی، غم کی رات، ہجر کے لمحات اور جذبات کے بوجھل پن کے تناظر میں پیش کیا ہے۔

داغ کی کثرت سے میرا سینہ تمام سیاہ ہو گیا
کیا بیان کروں کہ گلزار سے دوری نے کیا کیا[۲۳]
خوباں کی چشم سیاہ کی مروت کو دیکھ"[۲۴]

ان اشعار میں استعمال ہونے والے الفاظ داغ، اور چشم سیاہ سے کالا رنگ جھلکتا ملتا ہے۔

آب اور خاک ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ انسان خاک سے وجود میں آیا ہے اور اس وجود کے لیے پانی زندگی ہے۔ تو دوسری طرف پانی کی بنیاد جس پر پانی دندناتا پھرتا ہے خاک ہے۔ اگر ایک چیز مٹ جائے تو دوسری چیز خود بخود فنا ہو جائے گی۔ میر تقی میر نے اپنی شاعری میں آبی اور خاکستری رنگ کثرت سے استعمال کیا ہے۔ وہ ان رنگوں کو محبت کے کوچے سے خاک کی مانند اڑاتے ہیں تو کبھی سمندر کی لہروں کی مانند بہا دیتے ہیں۔

سرمے کی طرح بینائی میں اضافے کا باعث ہوئی
اگر میری طرف اس راہ گزر سے گرد آئی[۲۵]
یہ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا کہ میری کفِ خاک پر رو رہا ہے
میری آنسو بھری آنکھوں کا تربیت یافتہ ہے[۲۶]

ان سب رنگوں کے علاوہ دیوانِ میر میں حنائی، طلائی، صندلی، گلابی، آتشی، چمپئی، زنگ کا رنگ، شمعی، سرمئی جیسے رنگ کھلے ملتے ہیں اور ایسے باغ کا منظر پیش کرتے ہیں جس میں ایسے ایسے پھول کھلے ہوں جو مستعمل نہیں ہوتے۔

میر کے ہاں صرف ایک ایک رنگ کا استعمال نہیں ملتا بلکہ رنگوں کے امتزاج اور ایک رنگ کی دوسرے رنگ میں آمیزش بھی ملتی ہے۔ اس کی مثالیں پہلے درج کئے گئے اشعار میں سے بھی مل سکتی ہیں۔ ایک مثال کے ساتھ مزید وضاحت کرتے ہیں۔

سحر سے پہلے اس بزم سے اے چراغ کہ ہم
دوبارہ آ کر اس باغِ سبز کے لالہ کو دیکھ[۲۷]

ایک ہی شعر میں تین تین چار چار رنگوں کا امتزاج دکھلانا میر کا کمال ہے۔ سب رنگوں میں ایک ہی رنگ ہے اور وہی رنگ اصل، حقیقی اور دائمی ہے۔ باقی رنگ فانی ہیں۔ وہ رنگ ہے خدا تعالیٰ کا رنگ۔ صبغت اللہ۔ اس وجہ سے میر بھی سب رنگوں کی حقیقت اسی رنگ کو قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

تو بے رنگ ہے اور رنگ میں ظاہر ہوا
کہ جہاں (کے باغ) کو طرح طرح کے رنگ میں کھلا دیا[۲۸]

میر تقی میر کی ادبی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ میر ایک طرف دنیا کے داخلی مناظر، جس میں جذبات اور احساسات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کی مصوری کرتا ہے۔ تو دوسری طرف خارجی مناظر پیش کرنے کے لیے مشاہدات کا دامن تھام کر رنگوں کا استعمال اس خوبی سے کرتا ہے کہ لفظی تصویریں اُترتی جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کے ہاں دوہری منظر کشی ملتی ہے۔ میرے نزدیک ان پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ کسی بھکشو کی مانند جاپ کرنے میں ایسا کھوئے کہ خارجی دنیا سے لاتعلق ہو گئے، سراسر غلط ہے۔ میر رنگوں کے رنگ میں رنگ کر اپنی شاعری کو رنگین کرتا اور چار سو رنگینی بکھیرتا ملتا ہے۔

حوالہ جات

1. محمد حسین آزاد، آب حیات، (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1998ء) ص210۔
2. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، (لاہور، : سنگِ میل پبلی کیشنز، 2003ء،) ص221۔
3. محمد قلی قطب شاہ، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، مرتب، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1985ء)، ص402۔
4. مرزا محمد رفیع سودا، کلیاتِ سودا، فاروق ارگلی، مرتب، (نیو دہلی: فرید بک ڈپو، 2005ء،) ص92۔
5. سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، (لاہور: بک ٹاک، 2019ء)، ص 69
6. میر تقی میر، کلیاتِ میر، جلد اول، ظل عباس عباسی، مرتب، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1983ء،) ص550۔
7. نظیر اکبر آبادی، کلیاتِ نظیر، (دہلی: کتابی دنیا، 2003ء)، ص418۔
8. محمد حسین آزاد، آبِ حیات، (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1998ء) ص210
9. سید ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر، میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال، (کراچی: مرکز علومِ اسلامیہ، 1999ء،) ص113۔
10. میر تقی میر، دیوانِ میر فارسی مع اردو ترجمہ، افضال احمد سید، مترجم، (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، 2013ء،) ص17
11. ایضاً ص103
12. ایضاً ص199
13. ایضاً ص451
14. ایضاً ص29
15. ایضاً ص109
16. ایضاً، ص49
17. ایضاً ص139
18. ایضاً، ص69
19. ایضاً، ص55

20. ایضاً، ص97

21. ایضاً، ص141

22. ایضاً، ص251

23. ایضاً، ص19

24. ایضاً، ص91

25. ایضاً، ص127

26. ایضاً، ص125

27. ایضاً، ص29

28. ایضاً، ص23